''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' تاریخی تناظر میں

ماجد مشتاق رائے

Majid Mushtaq Rai

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

سعدیہ مشتاق

Sadia Mushtaq

M.Phil Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Fall of Dhaka is an important chapter of the History of Pakistan. In this regards there are different intellectuals made some historical views. Sidique Salik is one of them. He is part of that military team who had served in East Pakistan and made their efforts to calm down the situation at that time. He also wrote detailed situation in this historic movement. Int this article, light thrown on those aspects which create the worst situation in East Pakistan. It is a humble effort to show some hidden facts of the history.

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں تقسیم ہند کے بعد دوسرا اہم ترین واقعہ سقوطِ ڈھاکہ ہے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی تاریخ جہاں اس مملکتِ خداداد کی تاریخ کا اندوہ ناک واقعہ ہے وہیں ہمارے اکابرین کے اعمال کے محاسبے کا دعوت نامہ بھی۔ اس عظیم سانحے کے بعد حمود الرحمٰن کمیشن قائم کیا گیا اور پھر پاکستان میں بننے والے دیگر ایسے کمیشنز کی طرح اس کی رپورٹ بھی ردی کی ٹوکری کی زینت بنی۔ اس کی بڑی وجہ اس کمیشن کی رپورٹ کے منظرِ عام پر آنے میں غیر منطقی و غیر فطری دیر بھی تھی۔ اگر پاکستانی تاریخ کے بارے میں سنجیدگی کا طرزِ عمل اپنایا جاتا تو زیرِ نظر کتاب ایک اہم دستاویز کی صورت میں موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آئی ہے جسے بعد ازاں انگریزی سے اُردو ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کے مصنف بریگیڈیئر صدیق سالک سقوط ڈھاکہ کے عینی شاہد ہیں اور بطور کمیشنڈ آفیسر انھوں نے حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو کہ بالترتیب سیاسی اُفق، خانہ جنگی، جنگ کے عنوان سے ہیں جبکہ چوتھا حصہ ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔

مصنف نے ذیلی عنوان ایک جان دو قالب، میں مجیب الرحمٰن کی تقریر کا ذکر کیا جس میں ٹیپ کی صورت میں مجیب کی

آواز بنگلہ دیش کی خواہش کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''مجیب کے مطالبات اور عزائم کیا تھے؟ اس کی نشاندہی ایک اور ٹیپ سے ہوتی ہے جو یحییٰ خان کے محکمہ سراغ رسانی نے چوری چھپے تیار کیا تھا۔ اس میں مجیب کی آواز بند تھی۔ موضوع تھا، ایل ایف او[۱]۔۔۔ اس دستوری خاکے کے متعلق مجیب نے انجانے میں قریبی حلقوں میں حسب ذیل رائے کا اظہار کیا تھا۔ میرا قصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل ایف او کو پرزے پرزے کردوں گا کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ٹک سکے۔'' (۲)

اس ٹیپ کے متعلق حقائق سامنے نہیں لائے گئے بلکہ اس سے بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں کہ شیخ مجیب کے قریبی حلقوں سے اس طرح کی ٹیپ کا سامنے آنا کہیں اس لاڑکانہ پلان کا حصہ تو نہ تھا جس کا ذکر مصنف نے اسی کتاب میں آگے چل کر کیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ انتخابات کے نتیجے میں شیخ مجیب کو اپنی کامیابی کا یقین کس طرح تھا۔ اس حوالے سے قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ بنگالیوں کے احساسِ محرومی کی ایک تاریخ ہے جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی توڑی گئی تو خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان کے اس قول نے عوامی سطح پر اس محرومی کی طرف توجہ دلائی:

''جب میں گورنر جنرل تھا تو اختیارات کا محور وزیراعظم تھا اور جب میں وزیراعظم بنا تو اختیارات گورنر جنرل کے پاس چلے گئے۔'' (۳)

بعدازاں اس محرومی پر مہر اس وقت کی عدلیہ نے لگائی جب دستور ساز اسمبلی کے حوالے سے اس اقدام کو غیر آئینی قرار نہ دینا تھا۔ (۴)

۱۹۵۶ء کا آئین منظور ہوا تو یک ایوانی پارلیمنٹ میں ملک کے دونوں بڑے حصوں کو مساوات کی بنیاد پر برابر (۱۵۰/۱۵۰) نشستیں دی گئیں۔ (۵) گو کہ یہ امر برابری کی بنیاد پر احسن نظر آتا ہے مگر مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ ہونے کی بنیاد پر اسے مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں نے ناقابلِ قبول بنا دیا۔ ون یونٹ کا قیامِ پاکستان کی تاریخ میں کئی وزرائے اعظم کا استعفیٰ کی وجہ بنا اور اس پر مسلسل متضاد آراء سامنے آتی رہیں۔ یہ ون یونٹ ۱۹۵۶ء کے آئین کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہا جس سے مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کو موقع ملا کہ وہ عدم مساوات کا پرچار کر کے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکیں۔

ایک اور اہم وجہ جو شیخ مجیب کی کامیابی کی وجہ بنی وہ مغربی پاکستان میں قیادت کا فقدان تھا ۱۹۶۲ء کے آئین میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام سے مطلوبہ نتائج تو حاصل کر لیے گئے مگر مارشل لاء کے زیرِ سایہ کوئی بڑا لیڈر نہ تھا جو شیخ مجیب کی عوامی لیگ کا مقابلہ کر سکتا۔ جب کہ دوسری طرف حسین شہید سہروردی، نورالامین، مولانا بھاشانی اور پھر شیخ مجیب مشرقی پاکستان کے عوام کی آوز بنے رہے۔ یہ المیہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جاری رہا جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے اقتدار میں بھی کم و بیش یہی حالات رہے جونہی ان کا اقتدار ختم ہوا، ان کے حامیوں کو عوامی سطح پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

مصنف نے لاڑکانہ پلان کے تحت جنرل یحییٰ اور بھٹو کی ملاقات کا ذکر کیا جو لاڑکانہ میں ہوئی اور بھٹو صاحب نے جنرل یحییٰ کی خاطر مدارات کا تذکرہ بھی کیا۔ بعدازاں بھٹو کا ڈھاکہ جا کر مذاکرات کرنا بے اثر بھی اس لیے ہوا کہ مذکورہ بالا

ملاقات کے حوالے سے بنگالیوں میں خدشات تھے اور وہ کسی ان دیکھی سازش کو محسوس کر رہے تھے۔ مصنف نے ذوالفقار علی بھٹو کے انتخابات کے بعد کی کیفیت کا اظہار کچھ یوں کیا:

> ''جہاں تک بھٹو کا تعلق تھا، وہ بھی پنجاب اور سندھ میں اپنی جیت سے خوب پھولے بیٹھے تھے۔ ۲۰ دسمبر کو انھوں نے لاہور میں کہا، میری جماعت کے تعاون کے بغیر نہ تو کوئی دستور بنایا جا سکتا ہے اور نہ مرکز میں کوئی حکومت چلائی جا سکتی ہے۔'' (۶)

بھٹو صاحب کا یہ دعویٰ عجیب و غریب تھا کیونکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو نشستوں کی تعداد کے بعد ایسی بات دیوانے کی بڑ سے زیادہ نہ تھی مگر اس کا تاثر یحییٰ بھٹو گٹھ جوڑ کی صورت میں سامنے آیا جو کہ بالکل درست نہ تھا۔ پاک فوج ان انتخابات میں بالکل غیر جانبدار تھی۔ (۷) اور اگر یہ الزام درست مان لیا جائے تو پھر مشرقی پاکستان میں نتائج عوامی لیگ کے حق میں اس طرح کبھی نہ آتے جس طرح سامنے آئے۔

بھٹو صاحب کے اس طرح کے خیالات کے پیچھے وہ کامیابی تھی جو خود ان کی توقعات سے زیادہ تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ بھٹو نے جنرل ایوب خان کا دامن چھوڑ کر پارٹی منشور میں عوامی فلاح کے سہانے خواب دکھائے گو کہ یہ پارٹی نئی تھی مگر عوامی سطح پر اس کے بنیادی نعرے نے پذیرائی حاصل کی۔ اس پذیرائی کی توقع خود ذوالفقار علی بھٹو کو بھی نہ تھی۔ اس حوالے سے خورشید قصوری کی رائے حد درجہ اہمیت کی حامل ہے (مکمل واقعہ کا محل نہیں) وہ بیان کرتے ہیں:

> ''میں اور بھٹو صاحب پی سی ہوٹل لاہور کی ایک میز پر تھے۔ بھٹو صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ خورشید آئندہ انتخابات میں ہم کتنی سیٹیں جیتیں گے۔ مجھے یقین تو نہ تھا مگر میں نے بھٹو صاحب کی ناراضی سے بچنے کے لیے کہا دو، جس کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا کہ دیکھ لینا ہم دس سیٹیں جیتیں گے اور اگر نہ جیتیں تو میں تمھیں اسی میز پر کھانا کھلاؤں گا ورنہ تم کھلاؤ گے۔'' (۸)

اس گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھٹو صاحب اس غیر یقینی کامیابی پر کس طرح جذباتی ہوئے۔ سونے پر سہاگہ شیخ مجیب کا چھے نکاتی فارمولا اور اس پر شدت یہ امر بھٹو کو پاکستانی سیاست میں اہمیت دلاتا چلا گیا۔ ان حالات کے تناظر میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی افق پر سقوطِ ڈھاکہ کی بساط ایک دو سال نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا دوسرا حصہ ''خانہ جنگی'' کے عنوان سے ہے یہ حصہ اس حوالے سے اہم ہے کہ مصنف نے ایسے حالات کا بھی تذکرہ کیا ہے جسے تاریخ عام طور پر چھپاتی ہے۔ مثلاً بیان کرتے ہیں:

> ''ڈھاکہ چھاؤنی سے پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی فوراً جو دیپ پور روانہ ہوگئی۔ ہیڈ کوارٹر کے چند نوجوان افسر رضا کارانہ طور پر ساتھ ہو لیے۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے، تو بٹالین کا سارا علاقہ مقتل میں بدل چکا تھا۔ گندگی کے ایک ڈھیر پر پانچ بچے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ اُن کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے گئے تھے۔ اُن کی ماؤں کی مسخ شدہ لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر اوندھی پڑی تھی۔ صوبیدار ایوب ان میں اپنے کنبے کے افراد کو پہچان کر چلا اٹھا اور

انتہائی صدمے سے دماغی توازن کھو بیٹھا۔''(۹)

ایسی صورتِ حال میں شیخ مجیب اور 'مکتی باہنی' کا ردِعمل کس قدر شدید ہوگا اس کا اندازہ کوئی صاحبِ نظر ہی لگا سکتا ہے۔ ایسے واقعات مختلف شہروں اور دیہاتوں سے رپورٹ ہوئے جس سے مشرقی پاکستان کی عوام کا اپنی ہی فوج پر اعتماد نہ رہا اور ان کے جذبات فوج کے خلاف کس قدر شدت اختیار کر گئے، اس پر صاد یہ کہ سیاسی منظر نامہ میں بہتری کا کوئی واضح لائحہ عمل سامنے نہ آیا۔ ایسے ہی واقعات کے متعلق سینئر سیاستدان جاوید ہاشمی کہتے ہیں:

''مشرقی پاکستان میں جو صورتحال ہوئی میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کاش (آبدیدہ ہو کر) میں نے وہ منظر نہ دیکھے ہوتے۔''(۱۰)

ایسے واقعات کے تناظر میں انتظامیہ اور عوام کی بڑھتی ہوئی خلیج کو پُر کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی۔ باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان تو ہوا مگر اس سے مستفید ہونے والوں میں مجیب الرحمٰن شامل نہ تھا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کوشش بھی ضائع ہوئی دوسری طرف عوامی لیگ کی جگہ جنرل راؤ فرمان علی فارمولا کے تحت ضمنی الیکشن کی تیاریاں کرائی گئیں جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کتاب کے تیسرے حصے جنگ میں ان واقعات کا ذکر ہے جس نے اس عظیم سانحے پر مہر لگائی۔ بھارت کی طرف سے فوجی مداخلت، مکتی باہنی کی کارروائیاں اور پھر پے در پے انتظامی عہدوں پر بدلتے چہرے اور بدلتی ہوئی پالیسیاں۔ نومبر سے لے کر ۱۶ دسمبر کی صبح تک جنرل نیازی عوامی سطح پر یہ دعوے کرتے نظر آئے کہ ہم آخری آدمی آخری گولی کی بنیاد پر جنگ لڑ رہے ہیں مگر عجیب بات ہے کہ مصنف نے دعویٰ کیا کہ ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ ۱۴ دسمبر کو ہو چکا تھا، لکھتے ہیں۔ جنرل نیازی کے نام جنرل یحییٰ نے لکھا:

''گورنر کا پیغام مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے نہایت کٹھن حالات میں نہایت دلیرانہ جنگ لڑی ہے۔ قوم کو آپ پر فخر ہے۔ دنیا آپ کی تعریف کر رہی ہے۔ جہاں تک انسان کے بس میں ہے میں نے مسئلے کا قابلِ قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب آپ ایسے مرحلے میں جہاں نہ مزید مزاحمت ممکن ہے اور نہ اس مزاحمت سے کوئی سودمند مقصد حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے مزید جان و مال کا نقصان ہوگا۔ آپ کو ان حالات میں مسلم افواج، مغربی پاکستان کے رہنے والوں اور دوسرے وفادار لوگوں کی سلامتی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اس اثنا میں اقوامِ متحدہ سے درخواست کی ہے وہ ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جنگ بند کرنے کو کہے اور اس سے ہماری افواج کے علاوہ ان تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت مانگے جو شر پسندوں کے معاندانہ سرگرمیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔''(۱۱)

جنرل یحییٰ خان کے اس پیغام کے بعد اس کی ذمہ داری صرف اور صرف جنرل نیازی پر ڈالنا کس قدر خلافِ حقائق ہے جبکہ مصنف نے خود اس کتاب میں سیاستدانوں کی چالبازیوں، انتظامی عہدوں اور پالیسیوں کی بے دریغ تبدیلیوں، مجیب الرحمٰن کے خلاف مقدمے اور بعد ازاں ضمنی انتخاب کے نام پر سیٹوں کی بندر بانٹ کا ذکر کیا ہے لہٰذا جنرل نیازی کا جو انٹرویو کتاب کے آخر میں درج کیا گیا اس میں بھی جنرل نیازی کا مؤقف یہی تھا کہ اس سارے عمل کی ذمہ داری اگر کسی پر ہے تو وہ

راولپنڈی والے ہیں۔ایک سوال کے جواب میں جنرل نیازی نے کہا:

''یہ سب راولپنڈی والوں کا قصور ہے۔انھوں نے مجھے نومبر کے وسط میں آٹھ پلٹنیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا مگر صرف پانچ بھیجیں۔ میں باقی تین کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو انھیں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے استعمال کروں گا۔'' (۱۲)

اس مؤقف کو بھی من وعن تسلیم نہیں کیا جاسکتا مگر جنرل نیازی کی بات کو وسائل کی کمی کے تناظر میں بہر حال دیکھا جا سکتا ہے،اسی انٹرویو کے آخر میں جنرل نیازی نے نوے ہزار قیدیوں کو واپس لے جانے کی بات کی تو یہ سوچ بھی سیاست زدہ نظر آتی ہے کہ جنرل محاذِ جنگ پر زندگی اور موت کے فیصلے کی بجائے مصلحت سے کام لے۔ یہ سچ اُن حالات کی پیداوار تھی جس میں سیاستدانوں نے اپنے اپنے مفادات کو سامنے رکھا اور ارضِ پاک کی فکر سے بہت دور رہے۔ جنرل نیازی کا یہ موقف انھوں نے اپنی بیٹی کے نام بھارتی جیل سے خط میں بھی کیا جب ان کی صاحبزادی نے خواہش کا اظہار کیا کہ اگر میرا باپ لڑتے ہوئے شہید ہو جاتا تو وہ فخر سے زندگی گزارتی مگر اب ہارے ہوئے جرنیل کی بیٹی کہلانا شرمناک ہے۔ جواب میں جنرل نیازی نے لکھا:

''بات میری زندگی کی نہ تھی۔ مجھے تمہاری قسم اگر مجھے اکیلے لڑنا ہوتا تو آخری دم تک لڑتا اور شہید ہو جاتا مگر نوے ہزار بیواؤں اور ان کے یتیم بچوں کو روتے ہوئے دیکھنے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا۔'' (۱۳)

اس بیان اور بریگیڈیئر صدیق سالک کے درج کردہ انٹرویو کے آخری حصے کو دیکھا جائے تو اسے حقائق سے زیادہ اپنی شرمناک شکست پر ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش سے زیادہ تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔مختصراً یہ کہ پاکستانی تاریخ کے اس عبرتناک مرحلے پر آج بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے جہاں عوام الناس کو اپنی حب الوطنی پرکھنے اور تجدیدِ نو کی ضرورت ہے تو ساتھ ہی ساتھ سیاست کے نام پر اقتدار کے حصول کے لیے ہر حد تک جانے والے سیاستدانوں کے اعمال کا محاسبہ، ۱۹۷۱ء کے تناظر میں طاقت کے استعمال میں کوتاہیوں اور کمزوریوں کے مظہر تمام کرداروں کے کریہہ چہروں سے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ وفاقِ پاکستان کو مضبوط سے مضبوط تر اور ناقابلِ تسخیر قلعے کی صورت میں سامنے لایا جاسکے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ لیگل فریم ورک آرڈر: ایسا حکم نامہ جسے ہنگامی حالات میں آئین کے متبادل کے طور پر نافذ کیا جائے۔

۲۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، حرف آغاز، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۷ء، ص:۱۱

۳۔ الطاف گوہر، یادداشتیں، مشمولہ: جرات، روزنامہ، کراچی، ۱۶دسمبر ۱۹۷۸ء

۴۔ اس اقدام کو پاکستان کے بڑے بڑے تجزیہ کار، وکلا اور جج صاحبان بھی نظریۂ ضرورت کی پہلی مثال قرار دے چکے ہیں۔

۵۔ دستاویز آئین پاکستان، مشمولہ دساتیر پاکستان از محمد سرور، لاہور: علمی کتب خانہ، ۱۹۸۷ء، ص:۳۲۷

۶۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈھوبتے دیکھا، ص:۴۶

۷۔ ایضاً، ص:۴۲

۸۔ خورشید قصوری سابق وزیر خارجہ پاکستان نے یہ باتیں ''ہم'' چینل کے پروگرام میں نعیم بخاری کے ساتھ انٹرویو میں ۹ستمبر ۲۰۱۰ء کو بتائیں۔

۹۔ ایضاً،ص:۱۱۸

۱۰۔ جاوید ہاشمی نے یہ باتیں جیو ٹیلی ویژن کے پروگرام کیپٹل ٹاک،۱۶دسمبر۲۰۱۴ءکو بیان کیں۔

۱۱۔ ایضاً،ص:۲۵۵

۱۲۔ ایضاً،ص:۲۶۳

۱۳۔ یہ خط جنرل نیازی کے خطوط مطبوعہ نیازی پبلشرز میانوالی میں شامل ہے جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔

☆......☆......☆